یادگار یادیں اور تاثرات

قسط: دوئم

حضرت مولانا محمد یعقوب خان صاحب

روشن خیال مبلغ، مفکر اسلام، بے باک صحافی، موثر مقرر اور صبر و تحمل کا مثالی کردار

از کیپٹن (ریٹائرڈ) عبد السلام خان، امریکہ

والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو بچوں سے بے حد پیار تھا۔ میں نے زندگی بھر والد صاحب کو کسی میلے ٹھیلے، سینما یا دیگر لہو ولعب میں شامل ہوتے نہیں دیکھا۔ دفتر سے سیدھا گھر آتے اور بقیہ دن بچوں کے ساتھ گزارتے۔ تفریح کی خاطر گرمیوں میں پہاڑی مقام کی طرف ہجرت اور سردیوں میں ہفتہ میں دو مرتبہ مرغابی و تیتر کے شکار کی عادت شامل تھی۔ شکار پارٹی چند مخصوص دوستوں پر منحصر ہوتی تھی۔ ڈاکٹر غلام محمد صاحب (جن کا مطب برانڈرتھ روڈ پر تھا اور رہائش بھی وہیں تھی) ایک مستقل ساتھی تھے۔ ڈاکٹر غلام محمد صاحب کا ذکر خیر آیا ہے۔ تو عرض کرتا چلوں کہ یہ انسانیت و روحانیت کا حسین پیکر ایک عجیب وغریب شخصیت تھی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تادم آخر ڈاکٹر صاحب کو مونس وغم خوار اور ہمدرد و شفیق پایا اور ہم سے ہی نہیں بلکہ تمام خدا کی مخلوق سے ہمدردی کا برتاؤ تھا۔ سرخ و سفید نورانی چہرہ اور فرنچ کٹ داڑھی، گٹھا ہوا کسرتی جسم جو کہ کالج کے زمانہ سے لے کر آخیر تک کسرتی رہا۔

انہوں نے ہم لوگوں سے زندگی بھر فیس نہیں لی بلکہ بہت سے ایسے تھے جو ان کے دست شفا سے مفت فیض پاتے تھے۔ ابھی حال ہی میں ان کے صاحبزادے ڈاکٹر وحید احمد کو ساتھ لے کر میاں شریف صاحب (والد میاں محمد نواز شریف صاحب) کے پاس اپنے ایک بچے کی مائیگریشن کے سلسلہ میں حاضر ہوا۔ میاں صاحب میٹنگ سے اٹھ کر فوراً باہر تشریف لے آئے اور بہت دیر تک ڈاکٹر غلام محمد صاحب مرحوم کا ذکر خیر کرتے رہے اور ہماری فوری مدد فرمائی۔

والد صاحب حضرت مولانا محمد یعقوب خان صاحب ووکنگ انگلستان میں تھے جب کہ ان کے رفیق کی وفات کی اطلاع ملی۔ راوی کہتا ہے کہ زندگی میں پہلی دفعہ ہم نے خان صاحب کا صبر ایوبی کا دامن ہاتھ سے چھٹتے دیکھا اور وہ زار و قطار روتے رہے۔ جونہی ہم بھائیوں نے ہوش سنبھالا ہم سب بھی والد صاحب کے ہمراہ سیر و شکار پر جانا شروع ہو گئے۔ آخری بار جو ہم نے شکار اکٹھے کھیلا وہ غالباً 1956ء میں کھیلا جب کہ چونیاں کے پانیوں پر ہم سب مع ڈاکٹر غلام محمد صاحب اپنی کار پر شکار کے لئے گئے۔ واپسی پر کار کی بریکیں فیل ہو گئیں اور یہ ان بزرگوں کی موجودگی کا معجزہ ہی تھا کہ میں بغیر بریکوں کے کار چلا کر واپس پہنچ سکا۔

حضرت مولانا صاحب کا قد درمیانہ، جسم بھاری اور کسرتی، بھرپور داڑھی، سر پر ٹوپی یا پگڑی، فراک کوٹ اور پتلون ہر لباس ان پر اچھا لگتا تھا۔ وہ اندر اور باہر دونوں طرح سے خوبصورت تھے۔ خوش باش، خوش گفتار، خوش اطوار، پرعزم تمکنت اور وقار کا مجسمہ وہ ہر رنگ میں بھلے لگتے تھے کیونکہ ان کی طبیعت میں بھلے مانسیت کی چاشنی تھی۔ وہ من موہنے سے دھیمے سے مخلص انسان تھے۔ ان کے وجود کا ٹھہراؤ اور خلوص ان کے وزن کا مظہر تھا۔ سلیقہ ان کی شان اور قرینہ ان کی آن۔ وہ مدھم لہجے کے دردمند مرہم فروش تھے جن کے لفظوں کا حسن چاند بن کر چمکتا اور خوشبو بن کر مہکتا۔ وہ دکھیارے لمحوں میں درد کا اشتراک بھر کر زندگی کو گوارا بنانے کی سعی کرتا۔

مطالعہ فطرت بہت وسیع تھا۔ بنگال کی سحر انگیز سرزمین ہو یا کلکتہ کا عالیشان شہر، مدراس کی بندرگاہ ہو یا ہندوستان کی ریاستوں کے ٹھاٹھ، انگلستان ہو یا یورپ کی چمک دمک، انہوں نے ہر گھاٹ کا پانی پیا مگر وہ بنیادی طور پر غریب ایشیا کے مصیبت زدہ شہریوں کے ہمنوا تھے جن کا دل شہری دنیا کے دکھیارے انسانوں کے لئے حزین رہتا تھا۔ مگر وہ ہر اٹھنے والی آگ دل کے سمندر میں ٹھنڈا کر کے اس سے محبت کی گلابیاں مہکانے کی سعی کرتے رہے۔ آپ اس قبیلہ کشتگان سے تعلق رکھتے تھے جو گردش حالات کے ستائے ہوئے انسانوں کا رونا رونے کو بھی جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ ان کا قلم خود پسندی اور خود لذتی کے جذبوں کی صورت گری سے مملو نہیں تھا بلکہ وہ حصار ذات سے نکل کر استعمار حیات کی تسخیر کو فریضہ جان و روح خیال کرتے ہیں۔ وہ ان معنوں میں ایک آئیڈلسٹ تھے جو بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی اس دنیا میں اس عشق کو بھی حقیقت جانتے ہیں جو ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف علم جہاد بلند کرتا ہے۔ وہ ظلم کے اندھیروں میں اپنے فکر و خیال کے جگنوؤں کی روشنیاں بکھیرنا چاہتے ہیں۔ وہ شر کی قوتوں کے سامنے اپنے اثبات خیال کا جمال لا کر خیر کا سویرا ہویدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ صلیب فکر پر لٹکے ہوئے زبوں حال آدم کو اس کی عظمت رفتہ لوٹانا چاہتے تھے۔ حضرت مولانا نے اپنے نظریے اور فکر و خیال کی

طغیانیوں کو جمال سخن کی جراحت پر آمادہ نہیں کیا۔ ہاں جب ظلم ہوتا دیکھتے تھے تو ان کی تحریر کاٹ دار اور تیروں کی بوچھاڑ بن جاتی تھی اور پھر کلمہ حق کو سیدھے سادے لفظوں میں بیان کرنے کو جہاد اکبر سمجھتے تھے اور برطانوی حکوت کا سامراجی دبدبہ بھی ایسے حالات میں انہیں مرعوب نہ کر سکا۔ خواہ بادشاہ سلامت انگلستان کا نومسلم کزن لارڈ ہیڈلے ہو یا گفتار کا غازی علامہ اقبال وہ بلا جھجک اظہار خیال کرتے چلے جاتے تھے۔

ان کا ایک اور وصف شائستگی تھا۔ گفتگو میں نرمی اور حلاوت تھی۔ چھوٹوں میں بیٹھے ہوں یا بڑوں میں وہ ہر جگہ اپنی جگہ بنا لیتے تھے۔ نہ علمیت بگھارتے تھے اور نہ اپنے مقام و مرتبے کا رعب ڈالتے تھے۔ وہ ہر محفل میں ایک شائستہ و معصوم اپنائیت کا پیار مسکراہٹوں کے ساتھ بانٹتے چلے جاتے تھے۔ ایک پرسکون اور بارعب وضعداری اور ایک محبت آمیز موجودگی سے مجلس کو کشت زعفران بنا دیتے تھے۔ معتدل و ملائم آدمی تھے۔ کسی بھی معاملے میں وہ انتہا پسندی کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ زندگی گزارنے کا ایک ڈھب اور اسلوب بنا رکھا تھا جسے نبھاتے ہوئے سفر حیات پر گامزن تھے۔ کاغذ قلم کتاب سے دوستی۔ جو کام اکیڈیمیوں کے کرنے کی تھیں وہ اکیلے کرتے تھے۔ اخباری اداریوں کے انبار لگاتے چلے گئے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں سرگرم، مجالس علم میں تقاریر۔ یہ سب جاری تھا بغیر اشتہار اور ہوس شہرت کے۔ اب وہ سانچے ہی ٹوٹتے جا رہے ہیں جن میں یہ لوگ بنا کرتے تھے۔ حال ہی میں جو میرا تعارف مشہور صحافی احمد بشیر (اداکارہ بشریٰ انصاری کے والد) سے کرایا گیا تو موصوف نے مجھے کوئی لفٹ ہی نہیں کرائی۔ مگر جب پتا چلا کہ میں حضرت مولانا کا بیٹا ہوں تو بڑے تپاک سے بولے۔ بھائی! پہلے بتانا تھا۔ ہم آپ سے زیادہ عزت سے پیش آتے۔

حضرت مولانا صوبہ سرحد کے لئے باعث افتخار تھے کہ ایسا نابغہ روزگار روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ سردار عبدالرشید سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد نے جب مجھ سے درخواست کی کہ میں حضرت مولانا کی سوانح اور تحریرات کو کتابی شکل دوں تو یقیناً وہ سوچ رہے ہوں گے کہ جدوجہد آزادی اور صوبہ سرحد کی تاریخ کبھی مکمل نہ ہوگی جب تک کہ حضرت مولانا کا ذکر خیر اس میں شامل نہ ہو۔ یقیناً وہ برصغیر کے مسلمانوں کو جو کہ بیسویں صدی کے شروع میں ابھی تک قرون وسطیٰ کے خیالات میں جکڑے ہوئے تھے اکیسویں صدی کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتے تھے۔

حضرت مولانا ایک قلندر انسان تھے اور ساری زندگی اپنے حال میں مست رہے۔ ان کا دست طمع میر تقی میر کی طرح سرہانے رکھے رکھے ہی سو گیا تھا۔ روکھی سوکھی کھاتے رہے۔ کسی کے سامنے کبھی سر جھکایا نہ ہاتھ پھیلایا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب جھولی میں ہی سوچھید پڑے ہوں تو اسے پھیلا کر کیا ملے گا۔ قلندری شان تھی تو درویشی صفت۔ چھوٹے لوگوں سے شفقت سے ملتے اور بڑوں اور طنطنے والوں سے ایک شان استغنا کے ساتھ میل ملاپ رکھتے۔ پرواہ تو کسی کی بھی نہیں کرتے تھے۔ شیر کا دل اور عقاب کا جگر پایا تھا۔ خوف و خطر سے خالی وعاری زندگی 1927ء کے ہندو مسلم فسادات میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ایک راہ گیر ہندو کو مسلمان حملہ آور کے ہاتھوں سے بچایا اور بذات خود حملہ آور سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ساری زندگی مسلمانان برصغیر بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے لڑتے رہے۔ زمانے کے صدموں کا بھرپور مقابلہ کیا۔ غم دوراں کے مقابلے میں ایک چٹان تھے۔ گھریلو مصائب کے جو کوہ غم ان پر ٹوٹے وہ اگر بیان کروں تو قاری کا جگر پھٹ جائے گا۔ محترم والدہ صاحبہ 1929ء میں میرے چھوٹے بھائی ہمایوں اختر کی پیدائش کے وقت فالج زدہ ہو گئی تھیں اور 46 سال چارپائی پر گزار دیئے۔ حضرت مولانا نے جہاں اپنی پبلک زندگی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وقف کی تھی وہاں اپنی نجی زندگی اپنی معذور بیوی اور ہم چھ بہن بھائیوں کے لئے وقف کر دی اور عملاً ہمیں دکھا دیا کہ جو انسان اعلیٰ مقاصد کے لئے زندہ رہے وہ ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: **ترکنا فی الاخرین سلام علی ابراھیم ۔ کذالك نجزی المحسنین ۔** یہ ابراہیمؑ نے آنے والی نسلوں میں ''سلام علی ابراہیمؑ'' کا تحفہ چھوڑ دیا اور ہم اسی طرح محسنوں کو جزا دیتے ہیں۔ یہ تو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ والا انتہائی مقام قربانی بھی خدا کی دین ہے۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے جس نے اسمٰعیلؑ کو آداب فرزندی!

اس سرزمین کے ایک فرزند ہونے کے ناطے حضرت مولانا نے ''آداب فرزندی'' کا حق خوب ادا کیا اور تمام عمر اس سرزمین کے باسیوں کی حقوق کے حصول میں گزار دی۔

اپنی قلمی زندگی کے شروع میں ہی جو کہ 1920ء میں شروع ہوئی ہے حضرت مولانا کو اس بات کا پورا ادراک ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی صفوں میں سب سے بڑا شگاف کٹھ ملائیت کا پیدا کردہ فرقہ واریت کا شگاف تھا۔ اس لئے بار بار وہ پرچار کرتے تھے کہ جو کوئی بھی کلمہ گو ہے وہ ہمارا اپنا ہے خواہ وہ کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہو۔ انگلستان میں تبلیغ کے دوران بھی وہ صرف **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کی تبلیغ کرتے تھے اور عیدین کی نماز میں جہاں پورے انگلستان کا اجتماع شاہجہان مسجد، ووکنگ کے وسیع و عریض لان میں ہوتا تھا اس کی امامت کبھی تو کوئی نومسلم انگریز کراتا تھا، کبھی کوئی ایرانی اور کبھی کسی اور مکتب فکر کا فرد۔ 1948ء کی عید کے اجتماع میں وزیر اعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خان بھی تشریف لائے تھے۔ خاکسار مولف اس اجتماع میں شامل تھا۔ ہر ہائی نس آغا خان ووکنگ مسجد اور مشن کے سرپرست تھے اور اکثر جب تشریف لاتے تو

سادہ کاغذ منگوا کر بینک کے نام آرڈر لکھ دیتے کہ اتنی رقم ادا کر دو۔ امام ووکنگ سے قریبی تعلقات تھے۔ الغرض پاکستان کے حصول کی جنگ جو تحریک خلافت کے ناکام ہونے کے بعد اور نہرو رپورٹ کے ذریعہ ہندو عزائم کے بے نقاب ہونے کے بعد کے زمانہ میں زور پکڑنا شروع ہو گئی تھی۔ اس جنگ میں حضرت مولانا صف اوّل کے مجاہد تھے۔ قائداعظم جو ''لائٹ'' اور حضرت مولانا کے زبردست مداح تھے ان کی مومنانہ فراست نے بھی یہی نقطہ بھانپ لیا تھا کہ ہر وہ شخص جو خود کو مسلمان کہتا ہے مسلم لیگ کا ممبر بن سکتا ہے۔ چالیس کے عشرہ میں برکت علی محمڈن ہال لاہور میں ایک اجلاس کے دوران میں مولانا ظفر علی خان نے ایک خاص فرقہ کو کافر قرار دینے اور مسلم لیگ کی ممبرشپ سے خارج کرنے کی تجویز پیش کرنا چاہی اور وہ کھڑے ہو کر ابھی اپنا فقرہ پورا بھی نہ کر پائے تھے کہ قائداعظم نے ڈانٹ کر یہ کہہ کر انہیں بٹھا دیا: "Zafar Ali, Sit down!" مولانا ظفر علی خان جیسے آل انڈیا قد کاٹھ کے لیڈر کو اس طرح ڈانٹ کر بٹھا دینا قائداعظم کا ہی حصّہ تھا۔ یہ فوری فیصلہ اس لئے ضروری تھا کہ اگر یہ فتنہ ایک دفعہ سر اٹھا لیتا تو پھر یہ لامتناہی سلسلہ تکفیر چل نکلتا (جیسا کہ آج کل ہم فرقہ وارانہ قتل و غارت کی صورت میں دیکھ رہے ہیں) اور پاکستان کی منزل نا قابل حصول ہو جاتی۔

حضرت مولانا ایک فطری صحافی اور ادیب تھے اور ان کا انداز و اسلوب عین حقیقی اور دلی جذبات کے قریب تھا۔ وہ اقبال کی ''خودی'' کا ایک چلتا پھرتا شاہکار تھے۔ ایسے غیرت مند لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ پختون تصور ''انا'' یا خودی کی ایک سچی تصویر تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تحریر و تقریر پر کمال حاصل تھا۔ چھوٹے چھوٹے موتیوں کی طرح پروئے ہوئے الفاظ اور الفاظ بھی وہ جو دِل کی گہرائیوں سے نکلے ہوں۔

حضرت مولانا ایک اچھے انسان تھے، ہمدرد، خلیق اور ملنسار۔ دوسروں کے دکھ درد بانٹنے والے۔ ان کے دِل کے اندر انسانیت سے محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کی تحریریں ایک ترقی پسندانہ سوچ کی روشن قندیلیں تھیں۔ وہ ایک گہرا اسلامی شعور رکھنے والے روشن خیال دانشور تھے جو غریبوں سے محبت کو جزو ایمان سمجھتے تھے۔ وہ خود جس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس کی سچی ترجمانی کرتے تھے اور یہ سب قال ہی قال نہیں تھا بلکہ حال بھی تھا اور سب گھر کے افراد گواہ تھے۔ وہ اندر اور باہر سے ایک تھے اور **لما تقولون مالا تفعلون** کے قرآنی اصول کو اپنا کر پہلے حال اور پھر قال کی سٹیج پر آتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ڈوب کر لکھا پوری کمٹمنٹ کے ساتھ لکھا۔ وہ اپنے قلم کے ذریعہ سامراجی طاقتوں، برہمنی سازشوں، مذہب کے نام پر خرافات کو منہدم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی تحریریں کسی کرائے کے قلم کی موشگافیاں نہیں تھیں بلکہ دل کی آواز تھی۔

دِل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

حضرت مولانا ایک بھرپور انسان تھے۔ انہوں نے جاندار زندگی گزاری جس میں تصادم کی چقماق بھی تھی اور قوت کی حرارت بھی۔ جہاں ظلم ہوتا دیکھتے وہاں خاموشی کو گناہ تصور کرتے۔ سن بیس کے عشرہ میں تحریک خلافت کے ناکام ہو جانے کے بعد ہندوؤں نے پورے برصغیر پر ہندو راج کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے اور برصغیر کا جو حصہ بقدر آبادی ان کا بنتا تھا اس کے علاوہ مسلم اکثریتی علاقوں کو بھی ہڑپ کرنے کی سازش شروع کر دی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے علاوہ شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں کے ذریعہ انہوں نے عام مسلمانوں کے بنیادی عقائد اور عشق رسول کو تحلیل کرنے کیلئے ایک بہت ہی ناپاک مہم شروع کر دی اور ''رنگیلا رسول'' کی قبیل کی کتابیں لکھی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب سے بیزار کیا جائے اور ہندومت اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے۔ اس ابلیسی سازش کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

وہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
(ابلیس کا پیغام اپنے چیلوں کے نام)

اس وقت کی مولانا کی تحریریں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ 1927ء کے لگ بھگ ان کے مضامین عشق رسولؐ، غیرت اسلامی، مسلمانوں کی بے حسی پر ماتم اور انہیں یہ پیغام دینے پر مبنی ہیں کہ ''اب جنگ، جنگ کا اختتام جنگ'' کا وقت آ پہنچا ہے۔ اگر اب بھی نہ اٹھو گے تو پھر کبھی بھی نہ اٹھ سکو گے۔ انہوں نے مومنانہ فراست کے ذریعہ بھانپ لیا تھا کہ اب پاکستان کے حصول کی جنگ شروع ہو گئی ہے اور ان کے یہ الفاظ پورے بیس سال بعد پورے ہوئے جب کہ واقعتاً یہ جنگ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہر محاذ پر لڑی گئی اور جس میں لاکھوں انسان مارے گئے۔ لاکھوں زخمی ہوئے اور کروڑوں کو ہجرت کرنا پڑی۔

ان کے یہ الفاظ Now or Never جو کہ ان کے 1928ء کے ایک اداریہ کے آخری الفاظ ہیں کی بازگشت 28 جنوری 1933ء کو چوہدری رحمت علی کے مشہور پمفلٹ Now or Never میں سنائی دی۔ جس پمفلٹ میں چوہدری صاحب نے پاکستان کا پہلی دفعہ نام لیا اور پاکستان سکیم کو چار دانگ عالم میں متعارف کروایا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب خان جو کہ انیسویں صدی میں پیدا ہوئے بیسویں صدی کا آزاد خیال فرزند تھے۔ جن کی نگاہ اکیسویں صدی کے جدید تقاضوں پر مرتکز رہتی تھی۔ اسی لئے جدید دور کے تقاضوں کو نوک قلم پر لانے کے لئے اس دور کی لنگوا فرینکا یعنی انگریزی کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اُردو میں بھی لکھا مگر اُردو کی کم مائیگی اور

تنگی داماں کو دیکھتے ہوئے انگریزی کو اختیار کیا۔ بزبان اقبال ع: ''گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے''۔

انگریزی میں وہ دسترس حاصل کی کہ خود قائداعظم نے خراج تحسین پیش کیا۔ انگریزی میں انہماک کا یہ عالم تھا کہ حضرت خواب بھی انگریزی میں دیکھتے تھے جس کا ذاتی علم مجھے اس طرح ہوا کہ ایک رات گھپ اندھیرے میں کسی کے انگریزی بولنے کی آواز آئی۔ ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی کہ یہ انگریزی خواں ڈاکو کہاں سے نازل ہو گئے۔ اٹھ کر دیکھا تو حضرت مولانا نیند میں نہایت روانی سے انگریزی میں تقریر فرما رہے تھے۔ جدید فکر کے نتیجہ میں ان کے حروف میں بھی جدت کی جلترنگ بجتی نظر آتی۔ گویا پکار عصر ''جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو'' کو حضرت مولانا نے پوری طرح سمجھ کر اپنی تحریروں میں جدت کا جادو جگانا شروع کر دیا اور تمام عمر قریب نصف صدی تک اشہب قلم سے جو بھی موتی نکلے وہ جدید دور کی آزادی خیال کے نقیب تھے۔ اپنی تحریروں میں بار بار وہ اقبال کا پیغام کہ:

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

قوم کو اور بالخصوص قوم کے جوانوں کو یہ پیغام پہنچاتے رہے اور انہیں اکساتے رہے کہ روایتی توہمات اور کٹھ ملائیت کے مرتب کردہ مسخ شدہ اسلام کی ''حاضر و موجود'' زنجیروں کو توڑ کر بلندی فکر و عمل کے شاہین بنیں اور اسلام کی وہ تعبیر و تصویر اپنائیں جو قرآن پیش کرتا ہے۔ آپ کی نظر میں اسلام کا لب لباب تھا ''خدا کی وحدانیت اور بنی نوع انسان کی اخوت اور مساوات''۔ آپ نے برہمو سماج کے لیڈر پی، سی رائے کی وفات پر جو اداریہ لکھا جس میں انہوں نے اس عظیم مؤحد انسان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ایک مسلمان کے اوصاف کا حامل قرار دیا، ان کی وسعت نگاہی کی غمازی کرتا ہے۔ آزادی سے قبل کے تیس سال انہوں نے مسلسل ہندو کی عیارانہ چالوں کے خلاف جہاد کیا۔ مگر جہاں انہوں نے ''ہندو کو نشانہ تنقید بنایا وہاں ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا کہ ان کا روئے سخن ہر ''ہندو'' کی طرف نہیں بلکہ ان ہندو طبقوں کی طرف ہے جنہوں نے مسلمانوں کے حقوق کو غصب کرنے کا مکروہ پلان بنا رکھا تھا اور ان طبقوں میں سرفہرست آریہ سماج فرقہ تھا۔ حضرت مولانا نے بھانپ لیا تھا کہ اگر مسلمان بیدار نہ ہوئے تو ان کا حشر سپین کے مسلمانوں جیسا ہوگا۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے عزائم واضح تھے۔ حضرت مولانا کو علامہ اقبال سے سو فیصد اتفاق تھا کہ:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

مولانا کو یقین تھا کہ اگر قوم کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہونا ہے تو اسے پنڈت اور واعظ کے چنگل سے نکلنا ہوگا۔ پنڈت جو بتوں کی شکل میں نقوش کہن لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کرتا ہے اور غیر ہندوؤں کو ملیچھ قرار دیتا ہے اور واعظ جو ''دین ملائی سبیل اللہ فساد'' کی عملی تصویر بن کر اسلام کے نام پر خلق خدا کا خون بہانے کا درس دیتا ہے، دونوں ''حاضر و موجود'' کے طوق ہیں جنہیں گلے سے اتار کر پھینک دینے میں ہی قوم کی نجات ہے!

بعد کے واقعات نے حضرت مولانا کی پیش بینیوں کو بالکل صحیح ثابت کر دکھایا اور آج بھی بھارت میں ہندو جنونی طبقوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو حشر ہو رہا ہے، وہ حضرت کی مومنانہ بصیرت کی گواہی دے رہا ہے۔ بابری مسجد کا سانحہ اور ان گنت بے گناہ مسلمانوں کا قتل، اس ہندو جنونی ذہنیت کے تازہ ترین ثبوت ہیں۔ اندرا گاندھی کے قتل کے ردعمل کے طور پر دہلی میں تین ہزار سکھوں کا قتل اس خوفناک جنونی کیفیت کی ایک اور مثال ہے۔ دراصل برصغیر کا ہندو مسلم مسئلہ اگر صحیح تناظر میں سمجھا تو صرف چند ایک لوگوں نے سمجھا۔ 1906ء سے لے کر 1940ء تک ''اقلیتوں'' کے مفادات کے تحفظ کو موضوع مشق بنایا گیا اور کوشش یہ کی گئی کہ کسی طرح جمہوری پارلیمانی نظام کے اندر رہتے ہوئے اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہو جائیں۔ اس کے لئے بہتیرے جتن کئے گئے اور جداگانہ نمائندگی اور ''ویٹ ایج'' اور کئی دوسرے حیلوں سے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ بہت کم لوگوں نے بات کی تہہ کو پایا کہ مسئلہ اکثریت اور اقلیت کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ تو دو بالکل مختلف تہذیبوں، اسلام اور برہمنی تہذیب کے تصادم کا ہے۔ اسلام جو انسانی بھائی چارے اور مساوات کا مذہب ہے وہ نہ صرف ایک خدا اور انسان کے باہمی تعلقات کا تعین کرتا ہے بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور اس کا زیادہ زور انسان اور اس کے ہمسائے کے باہمی حقوق و فرائض پر ہے۔ ہندومت ایک ذات پات پر مبنی مذہب ہے جو تمام حقوق اونچی ذات والوں کو تفویض کرتا ہے اور تمام فرائض اور زندگی کا بوجھ نچلی ذاتوں پر ڈالتا ہے۔ تمام عزت و استحقاق برہمنوں کو حاصل ہیں اور تمام بندگی اور خدمت دوسرے کی گردن کے گرد ڈال دی گئی ہے۔ یہ دو زلزلہ خیز تہذیبی ''فالٹ لائن'' پنجاب میں سے گزرتی تھی اس لئے زلزلہ کی سب سے پہلی ارتعاش پنجاب میں محسوس کی جاتی تھی۔ حضرت مولانا نے لاہور میں بیٹھ کر اس زلزلہ کی پہلی گڑگڑاہٹ کو محسوس کیا اور جان لیا کہ وقت تصادم نزدیک آ پہنچا ہے۔ تحریک خلافت جسے اگر تحریک حماقت کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا کے معاً بعد ہی ہندوؤں نے اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کیا اور کئی ایک محاذوں پر باقاعدہ یلغار شروع کر دی۔ حضرت مولانا کی اس زمانے کی تحریریں

گویا جنگ کے طبل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے یادگار اور زوردار اداریے ''جنگ جنگ تا اختتام جنگ (A Fight to the Finish)۔'' آنے والی جنگ'' (The Coming Fight)۔ ''سپین ان انڈیا''۔ ''ہر ہندو ایک راج پال'' وغیرہ گویا ایک اعلان جنگ ہیں۔ ''جنگ جنگ تا اختتام جنگ'' میں حضرت مولانا نے مسلمان نوجوانوں کو پکارا اور کہا:

''اپنے آپ کو منظم دستوں اور جتھوں میں صف آرا کرلو۔ ہم اب حالت جنگ میں ہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ نبی کریم صلعم اور ان کے صحابہ ان حالات میں کیا کرتے تھے؟

''وہ دن رات ہتھیار بند رہتے تھے! یہ ہوتا ان کا آج کا دستور جیسا کہ مدینہ میں ایسے حالات میں ہوتا تھا۔ چاہئے کہ آج کے مسلمان انڈیا کا بھی یہی نعرہ ہو یعنی ''رات دن ہتھیار بند رہو، فولاد کے ہتھیار، روپے کے ہتھیار، تنظیم کے ہتھیار'' آرام اور چین جیسے الفاظ غداری کے مترادف سمجھ کر اپنی لغت سے نکال دو۔ جنگ، جنگ تا اختتام جنگ، یہ وقت کی پکار بھی ہے اور ٹھنڈے دل و دماغ پر مبنی کامن سنس کی بھی۔ یہ ہے حضرت مولانا محمد یعقوب خان صاحب کی 16 اگست 1927ء کی تحریر اور اس کے ٹھیک بیس سال بعد اس دو تہذیبی تصادم کی جنگ کے نتیجہ میں مملکت خداداد پاکستان وجود میں آئی۔ یہ جنگ نہ صرف ''بیلٹ'' (ووٹ) بلکہ ''بلٹ'' (گولی) سے بھی لڑی گئی اور لاکھوں جانوں کی قربانی کے بعد ہمیں یہ سرزمین ہاتھ آئی۔ اس طبل جنگ بجانے کو جرم گردان کر انگریز حکومت نے مولانا کو پابند سلاسل کر دیا مگر گرفتاری سے پہلے مولانا نے یکم ستمبر 1927ء کو ایک زوردار اداریہ ''ایک جرم کا اعتراف'' (Confession of a Crime) لکھ کر اس بات کا ببانگ دہل اعلان کیا کہ وہ اپنی قوم کو آنے والی جنگ کے متعلق خبردار کرنا اپنی مذہبی و قومی فریضہ سمجھتے ہیں اور اگر اس ''جرم'' کی خاطر انہیں سزا بھگتنی پڑے گی تو وہ خندہ پیشانی سے اس کو قبول کریں گے۔

حضرت مولانا گونام میں انجمن کے ملازم تھے مگر نوکری میں بھی اپنی آن اور شان قائم رکھے ہوئے تھے۔ یہی حال روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کی ایڈیٹری کے دوران تھا۔ نوکری میں وہ اپنی محنت بیچ رہے ہوتے تھے مگر ضمیر اور ذہن کا سودا نہ کبھی کیا اور نہ کبھی سوچا۔ ان کا ذہن اور خیال کسی کا نوکر نہیں تھا۔ وہ ذہنی طور پر ہمیشہ آزاد اور بلند پرواز رہے۔ مولانا کا قلم کسی دھڑے، کسی سیاسی نظریے، کسی سیاسی پارٹی اور کسی انداز فکر کا ترجمان نہیں تھا۔ تھا تو حق و انصاف کا۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس کے عشرہ میں جب ''لائٹ'' میں حضرت مولانا نے خبر لگائی کہ سرحد کی مسلم لیگ منسٹری اس وجہ سے ٹوٹی کہ وہ کرپٹ تھی تو قائداعظم نے جو خود بھی سچ اور حق بات کے زبردست حامی تھے، اپنے ''ڈان'' کو حکم دیا کہ یہ خبر روزنامہ ''ڈان'' میں بھی دہرائی جائے، چاہے یہ اپنی ہی پارٹی کی منسٹری کے خلاف تھی۔ قائداعظم کو ''لائٹ'' کے ایڈیٹر پر اتنا اعتماد تھا کہ اگر ''لائٹ'' کا ایڈیٹر کہتا ہے کہ منسٹری کرپٹ تھی، تو بات درست ہوگی اور اس لئے خبر کو قابل یقین گردانا۔ حضرت مولانا کی ترجیحات کچھ یوں تھیں، اوّل رشتہ انسانی دوم رشتہ اسلامی سوم رشتہ قوم یعنی رشتہ پٹھانی۔ وہ بنی نوع انسان کو ایک خاندان تصور کرتے تھے اور انسانی اقدار کے زبردست حامی تھے۔ پھر وہ نبی کریم صلعم کی امت کے فرد کے طور پر ملت محمدیہ کے پرجوش ترجمان رہے اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے نصف صدی تک قلمی جہاد کیا۔ اس کے بعد اپنی قوم پٹھان کے لئے بڑا درد اور جوش رکھتے تھے اور ہر موڑ پر پٹھانوں کی رہنمائی کی۔ گو عبدالغفار خان سے بھائیوں جیسے تعلقات تھے اور سرخ پوش تحریک کے پس پردہ زبردست حامی تھے مگر جب من حیث القوم امت محمدیہ کے مستقبل کے فیصلہ کا نازک وقت آیا تو عبدالغفار خان کی کانگریسی سیاست سے اختلافات کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا اور تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ مگر یہ ان بزرگوں کی عظمت کی نشانی تھی کہ سیاسی اختلافات کے باوجود دوستانہ تعلقات بدستور قائم رہے۔ غفار خان جب لاہور آتے تو سب سے پہلے حضرت مولانا سے ملنے ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے دفتر تشریف لاتے۔ میں نے کسی غیر سیاسی آدمی کو ان سے بڑا قائد کا چاہنے والا نہیں دیکھا۔ وہ قطعاً غیر سیاسی آدمی تھے یعنی عملی سیاست سے بالکل الگ تھلگ خدمت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ میں منہمک مگر بقول اقبال:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وہ بحیثیت ایک خادم دین ہونے کے مسلمانوں کی سیاسی دستگیری کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے اور سن بیس سے لے کر قیام پاکستان تک آپ کا قلم برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر چلتا رہا۔ 1928ء میں علامہ اقبال کے خطاب الہ آباد سے دو سال تک انہوں نے مسلمانوں کے حق خودارادیت اور ایک علیحدہ قوم ہونے کے نظریہ کو لائٹ میں شائع شدہ اداریہ ''بیلنس آف پاور'' میں بڑے مدلل اور جامع طریقہ سے پیش کیا اور اعلان کیا کہ جب تک برصغیر میں آباد ان دونوں قوموں میں برابری کی بنیاد پر طاقت کا توازن دو علیحدہ اور آزاد ملکوں کی صورت میں قائم نہیں ہو جاتا، برصغیر میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔ حضرت مولانا کا کسی پارٹی سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں تھا ان کی بس ایک ہی پارٹی تھی، پاکستان پارٹی۔ ان کا بس ایک ہی قائد تھا محمد علی جناح!

شروع سے ہی جب قائداعظم انگلستان سے 1935ء میں واپس آئے حضرت مولانا نے قائد کی غیر مشروط اور بھرپور حمایت شروع کر دی۔ ان کا بس ایک ہی نظریہ تھا، نظریہ پاکستان۔ ان کا بس ایک ہی آئین تھا آئین قرآن۔ وہ قلم کو تلوار بنا کر دشمنان اسلام و وطن پر برساتے رہتے تھے۔ مگر کسی بھی جگہ عملی شائستگی اور ادبی ثقافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ جہاں بھی گئے اپنے نقوش چھوڑ آئے۔ جس سے ملے اس کے دل میں گھر کر آئے۔ ان کے مخالف بھی مانتے ہیں کہ ان کا خلوص سمندر جیسا تھا اور ان کا عزم پہاڑوں سے بلند، ان کا صبر حضرت ایوب کے صبر کی مانند۔ حضرت قرآن کریم کے آئین کو مذہب اسلام کا بنیادی آئین مانتے تھے فروعی وفقہی بحثوں میں پڑنا تضیع اوقات سمجھتے تھے۔

احکام تیرے حق میں ہے مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا دیتے ہیں پازند

''لائٹ'' کے کسی قاری نے وضو کے آداب و طریق کے متعلق سوال کیا تو جواب میں لکھا کہ وضو کا مقصد ہے طہارت جسمانی اور اگر منہ ہاتھ پاؤں تسلی بخش طور پر دھو لئے جائیں تو مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس جواب کو ملا کی موشگافیوں کے سامنے رکھا جائے تو حضرت مولانا کی طرز فکر نمایاں ہو جاتی ہے۔ آپ اسلام میں فرقہ واریت کے لئے کسی جگہ کے قائل نہ تھے اور تمام فرقوں کو قابل احترام سمجھتے ہوئے بھی ان کی افادیت کے قائل نہیں تھے۔ تمام عمر نماز قریب ترین مسجد میں ادا کی خواہ وہ کسی فرقہ کی بھی ہو۔ مولانا کی ذات دھڑے بازیوں، فقہی مناقشات اور چھوٹی سطح کے مذہبی اختلافات سے بہت بلند و بالا تھی۔ وہ اسلام کو ایک عالمگیر سچائی سمجھتے تھے جس کی بنیاد خدا کی وحدانیت اور بنی نوع انسان کی مساوات اور بھائی چارے پر رکھی ہوئی ہے۔

انگریزی بولتے تھے تو لگتا تھا ایک دریا ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ فی البدیہہ تقریر کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ایسی بامحاورہ اور شستہ انگریزی میں تحریر وتقریر کہ انگریز بھی عش عش کر اٹھیں۔ ذہانت تھی کہ ہر ہر لفظ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ وہ ذہانت وفطانت کے ایسے کوہ پیکر وقار تھے کہ جس کے سامنے دوسرے لوگ بونے معلوم ہوتے تھے۔ میرے عزیز دوست ڈاکٹر محمد مسعود مشہور سرجن وسابق پرنسپل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور بیان فرماتے ہیں کہ سن تیس کی دہائی میں جب ہم لوگ کالج میں پڑھتے تھے تو ہم حضرت مولانا کے انگریزی لیکچرز جو سیاسی و مذہبی عنوانات پر وائی ایم سی اے، لاہور میں ہوا کرتے تھے۔ بڑے شوق سے سننے جاتے تھے اور ہمارے سینے فخر سے تن جاتے تھے کہ ایک مسلمان عالم دین کس خوبصورتی سے انگریزی میں تقریر کر رہا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت جب کہ صوبہ سرحد میں ریفرنڈم ہونا قرار پایا تھا تو حضرت مولانا نے قلم کو چھوڑ کر میدان عمل میں اترنے کا فیصلہ کیا اور صوبہ سرحد کا لیکچر ٹور کیا۔ صوبہ سرحد میں پاکستان کے حق میں ریفرنڈم کا فیصلہ کروانے میں آپ کے زور خطابات کا بھی ہاتھ تھا۔ چونکہ پشتو تو آپ کے گھر کی لونڈی تھی اور آپ کو اس زبان پر ماہرانہ گرفت حاصل تھی، اس لئے آپ کی پشتو تقریروں کو صوبہ سرحد کے لوگوں نے بڑی دلچسپی سے سنا۔ آپ نے دیہات کے سادہ لوگوں کو پاکستان کا مطلب بڑے سادہ الفاظ میں سمجھایا اور انہیں بتایا کہ پاکستان بنتے ہی ان کی قسمت کھل جائے گی اور سب مسائل حل ہو جائیں گے۔ ایک درویش کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اللہ نے سچ کر دکھائے۔ آپ نے 1922ء میں جو تقریر آکسفورڈ یونیورسٹی انگلستان میں Mysticism in Islam (اسلام میں تصوف) کے موضوع پر کی وہ ایک یادگار تقریر ہے اور حال ہی میں اسی نام کی جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں شامل ہے۔

بحیثیت امام ووکنگ مسجد اور ایڈیٹر اسلامک ریویو آپ کو متعدد بین الاقوامی مذہبی اجتماعوں میں اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے بلایا جاتا تھا اور وہاں آپ سادہ اور دلنشین الفاظ میں اسلام کی تعلیمات پیش کرتے تھے۔ ایک بہت اعلیٰ سطح کی مذہبی کانفرنس میں آپ کو بلایا گیا۔ فرماتے تھے کہ میں بہت فکر مند تھا کہ کیا میں اس بین الاقوامی سطح کے دانشوروں کی کانفرنس میں اسلام کی کماحقہ صحیح نمائندگی کر سکوں گا۔ اسی اثنا خواب میں مجھے دکھایا گیا کہ میں حاضرین جلسہ کی طرف موٹے موٹے پتھر اٹھا اٹھا کر پھینک رہا ہوں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اسلام کی موٹی موٹی بنیادی تعلیم کے اصول انہیں بتائے جائیں اور چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ انگریزی، اردو، پشتو کے علاوہ آپ کو فارسی پر بھی عبور حاصل تھا۔ ایک مرتبہ جب سن پچاس کی دہائی میں ایرانی مجتہدین کا ایک وفد ووکنگ میں جمعہ کی نماز کے لئے آیا تو آپ نے ان کی خاطر خطبہ جمعہ فارسی میں دیا۔

تمام مسلمانان عالم کے لئے آپ کا دل محبت و ہمدردی کے جذبات سے معمور تھا۔ 1965ء میں جب برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مصر پر حملہ کر کے نہر سویز پر قبضہ کر لیا تو پورے عالم اسلام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔

حضرت مولانا محمد یعقوب خان اس وقت امام ووکنگ مسجد تھے۔ آپ کی سربراہی میں لندن کے عین دل میں ٹرافالگر سکوائر میں ہزاروں مسلمانوں کی ایک زبردست ریلی منعقد ہوئی جہاں حضرت مولانا نے اس کھلی جارحیت کے خلاف زوردار تقریر فرمائی۔ اس عالمی ردعمل کے نتیجہ میں جارح ملکوں کو گھٹنے ٹیک دینے پڑے اور فوجیں واپس بلانی پڑیں۔ یہ عالمی رائے عامہ کی بہت بڑی فتح تھی۔